بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

تاریخ کے لاتعداد روح فرسا واقعات میں ایک عظیم حادثہ یہ ہے کہ انسان نے ماضی کے حالات و واقعات کو پوری طرح جاننے کے باوجود اُن سے بہت کم عبرت حاصل کی ہے۔ اُس کے قدم پلٹ کر انہیں راستوں پر اٹھتے ہیں جن کی تباہ کاریوں سے وہ بخوبی آشنا ہوتا ہے۔ تاریخ کے ہر موڑ پر خطرات کے نشانات اُسے مسلسل متنبہ کرتے رہتے ہیں لیکن انسان ہے کہ وہ پھر پھر کر انہی خطرناک راہوں پر گامزن ہونے کی کوشش کرتا ہے جن کے سروں پر عمیق غاریں ہیں اور جن میں دنیا کی بیشمار قومیں گر کر نیست و نابود ہوتی ہیں۔ ایک مفکر نے انسان کی اسی فطرت کا ذکر کرتے ہوئے کہا "میں نے مطالعۂ تاریخ سے جو چیز اخذ کی ہے وہ یہ ہے کہ انسان نے تاریخ سے کبھی کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔"

یہ بات یُوں تو ہر فرد اور ہر قوم کے معاملے میں صحیح ہے اور اس کی صحت پر وہ سارے لوگ شاہد ہیں جنہوں نے کبھی بھی تاریخ پر ایک گہری نگاہ ڈالی ہے۔ لیکن اگر آپ اقتدار کی داستاں کا مطالعہ کریں تو آپ اسے حرف بحرف صحیح پائیں گے۔ وہ اقتدار جو غیر مسئول ہو اور جس کے دل میں خوفِ خدا نہ ہو وہ بار بار اسی حادثہ کا شکار ہوتا ہے لیکن اُس کی آنکھیں نہیں کُھلتیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ جو اقتدار مسئولیت کے احساس سے بے پروا ہو وہ عنانِ اختیار سنبھالتے ہی جلد بدمست ہو جاتا ہے اور پھر اس مستی کے عالم میں وہ اندھا بہرا ہو کر جس طرف چاہتا ہے چل نکلتا ہے اور کبھی اس بات کو سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ وہ جس راہ پر بے لگام ہو کر بھاگا جا رہا ہے اُسی راہ پر اس کی تباہی اور بربادی کے لیے ڈائنامیٹ بچھے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے اُس کے بہت سے پیشروؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ غیر مسئول اقتدار واقعی ایک نشہ ہے، ایک جنوں ہے جس کے زیر اثر آ کر انسان کے اندر غور و فکر کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں اور وہ ایسی

حرکات کا ارتکاب کرتا ہے جن پر عقل ماتم کرتی ہے۔

آپ اس حقیقت کو صرف ایک مثال کی روشنی میں دیکھیں۔ انسان نے بار بار کئی قسم کے تلخ تجربات کے بعد اس بات کو جانا ہے کہ ذی عقل انسانوں پر حکومت کرنے کے اصول گلہ بانی سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ انسان کو جب تک کسی بات پر اطمینان نصیب نہیں ہو جاتا وہ کبھی بھی اُسے خوش دلی سے قبول کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں پاتا۔ اگر کسی نظریہ کو اُس پر بالجبر ٹھونسا گیا یا قوت اور طاقت کے بل بوتے پر اُس سے کوئی بات منوانے کی کوشش کی گئی تو یہ طرزِ عمل نتائج کے اعتبار سے ہمیشہ مضرت رساں ثابت ہوا۔ اُس شخص یا گروہ نے وقتی مصلحت کی بنا پر کچھ دیر کے لیے تو خاموشی اختیار کر لی لیکن اُس کے سینے میں اس نظریے کے خلاف ہمیشہ نفرت اور حقارت کی آگ سلگتی رہی اور وہ برابر اس موقع کی تلاش میں رہا کہ کسی طرح اس سے نجات حاصل کی جائے۔ چنانچہ اسے شکست دینے کے لیے جو سازش بھی ہوئی وہ اس میں غم و غصہ کے شدید جذبات لیکر شریک ہوا۔ اُس کے دل میں یہ چھپتا ہوا احساس پرورش پاتا رہا کہ یہ وہ نظریہ ہے جسے مجھ پر مسلط کرنے کے لیے میری کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

یہ احساس جب ایک مرتبہ ذہن میں بیٹھ جاتا ہے تو انسان کا ذہنی توازن کبھی بھی برقرار نہیں رہتا۔ پھر انسان اُس شخص یا گروہ کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اور اس کی ہر بات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ اگر کوئی قدم اس کی خیر خواہی کے لیے بھی اٹھاتا ہے تو اس کا دل اُس پر بھی کبھی مطمئن نہ ہوتا۔ کیونکہ جس شخص یا گروہ کے بارے میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ کسی فرد یا طبقہ کی بے کسی اور بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا عادی ہے اُس کے متعلق دل میں کبھی کوئی جذبۂ سپاس گزاری پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ہر فعل کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

انسان کا یہ طرزِ عمل اُس کی فطرت کا خاصہ ہے اور قدرت نے اس کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ دیکھیے خود اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو نظامِ زندگی عطا کیا ہے اُس کی پوری حکمتیں سمجھائی ہیں۔ اگر توحید کی وضاحت

کی گئی ہے تو اس معاملہ میں دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ شرک انسان کے لیے سب سے بڑا ظلم ہے۔ توحید رسالت، قیامت، اور اسی قسم کے بہت سے ایسے اساسی مسائل جن کی حیثیت ایمانیات کی سی ہے انہیں لوگوں کے دل و دماغ میں بٹھانے کے لیے غور و فکر کا فطری طریق ہی اختیار کیا گیا ہے۔ پھر ایمانیات سے گزر کر جہاں اوامر و نواہی کا تذکرہ ملتا ہے وہاں بھی ہر ایک کی علت بتائی گئی ہے تاکہ انسان کے دل و دماغ میں کوئی اضطراب اور خلش باقی نہ رہے۔ سزا کی باری سب سے آخر میں آتی ہے۔ جب کسی شخص کی فطرت اتنی مسخ اور اس کی عقل اتنی ماؤف ہو چکی ہو کہ وہ حق و صداقت کو محض چڑ اور ضد کی بنا پر سننے کے لیے تیار نہ ہو تو پھر اُسے عذابِ الٰہی کی وعید سنائی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآنِ حکیم کا انداز ترغیب الگ اور اُس کا معیارِ حکمت جُداگانہ ہے لیکن انسان کے قلب و دماغ سے شک کے کانٹے نکالنے میں اُس نے وہ ساری تدابیر اختیار کی ہیں جو کسی باشعور اور صاحبِ دل انسان کے بس کی جا سکتی ہیں۔

انسانوں میں بھی وہ اصحابِ اقتدار جنہوں نے انسانی نفسیات کے اس اہم پہلو کو سامنے رکھ کر عوام سے معاملہ کیا ہے وہ کامیاب رہے ہیں اور تاریخ میں اُن کا شمار ظالموں کی صف میں نہیں بلکہ خادمانِ انسانیت کی صف میں ہوا ہے۔ وہ جس نظریہ کو صحیح اور درست سمجھتے تھے اور اسے دنیا میں غالب دیکھنے کے متمنی تھے۔ اُس کے لیے انہوں نے سب سے پہلے لوگوں کے قلب و دماغ کو قبولیت کے لیے آمادہ کیا۔ بڑی حکمت اور دانائی کے ساتھ اُس کی خوبیاں عوام کے ذہن نشین کرائیں اور بڑی دانشمندی کے ساتھ یہ بتایا کہ اسے قبول کر لینے کے بعد انہیں فلاں فلاں فوائد حاصل ہوں گے اور رد کرنے کی صورت میں انہیں اس نوعیت کے نقصانات برداشت کرنے پڑیں گے۔ اُن کی قوتوں اور صلاحیتوں اور اُن کے ذرائع و وسائل کا معتد بہ حصّہ دل و دماغ کو تبدیل کرنے میں صرف ہوا اور اس کے بعد کہیں جا کر اُس نظریہ کے تسلط کا اعلان کیا گیا۔ اسی طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکمران گروہ کو اپنے عزائم بروئے کار لانے کے لیے بہت کم مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب اذہان پہلے ہی کسی چیز کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو چکے ہوں اور دل پہلے اُس کی افادیت اور صداقت کو تسلیم کر چکے ہوں تو پھر اُس چیز کی بالادستی کا اقرار کرنے میں کوئی دقت

محسوس نہیں ہوتی بلکہ ان حالات میں آدمی اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لیے بیقرار رہتا ہے اور وہ جب تک اس میں کامیاب نہیں ہوتا اس کی بنیابی ختم نہیں ہونے پاتی ۔

جو لوگ اس گروہ سے نسبتاً زیادہ جلد باز، جذباتی اور جوشیلے واقع ہوئے انہوں نے اس سے قدرے مختلف طرزِ عمل اختیار کیا ۔ انہوں نے سب سے پہلے قوت کے زور سے اپنے دل پسند افکار و نظریات کو عوام پر مسلط کرنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کیں اور جب اس مہم میں وہ خاصے کامیاب ہو گئے تو پھر نشر و اشاعت کے ذریعے ان کے روشن اور تابناک پہلوؤں سے عوام کو آشنا کیا تاکہ اُن کے دل میں ان کے لیے جذبۂ احترام پیدا ہوا اور وہ ان کی افادیت اور سود مندی کے قائل ہو جائیں ۔ یہ جذباتی گروہ بھی اس واضح حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ کر سکا کہ جن تصورات کے بارے میں عوام کے دل و دماغ مطمئن نہ ہوں اور جنہیں ان کے شعور نے پوری طرح اپنا نہ لیا ہو اُن کی دیر تک بالادستی قائم نہیں رکھی جا سکتی ۔ دل کی دنیا ایک ایسا گوشہ ہے جس پر آج تک جبر کی کبھی بھی حکمرانی قائم نہیں ہو سکی ۔ یہ محدود سلطنت بڑے بڑے جباروں اور قہاروں کی قہرمانیوں میں بھی آزاد رہی ہے ۔ یہاں صرف انہیں نظریات نے فرمانروائی کی ہے جن کے حق میں خود قلب و دماغ نے ووٹ ڈالا ۔ یہاں کسی قسم کی کوئی ریشہ دوانی کامیاب نہیں ہو سکتی بلکہ اس نوع کی جو کوشش بھی کی جاتی ہے وہ اس سلطنت کے اندر بغاوت کے شعلے بھڑکانے کا ذریعہ بنتی ہے ۔ ہر جبر کا یہاں ایک شدید ردِ عمل پیدا ہوتا ہے، اور ہر ظلم یہاں جذبات کو مشتعل کرتا رہا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے جبرہ دستوں کو کبھی بھی مدت دراز تک ریشہ دوانیوں کی مہلت نہیں ملی ۔ انہوں نے جب بھی اقتدار کے نشے میں بدقسمت ہو کر محض قوت کے زور سے اپنی مرضی کو عوام پر مسلط کرنا چاہا تو اُن کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت اور حقارت کا ایک شدید جذبہ رونما ہوا جس نے آہستہ آہستہ ایک خطرناک تحریک کی صورت اختیار کر لی اور اُس نے بالآخر اس بپھرے ہوئے اقتدار کو بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ۔

تاریخ کا یہ ایک نہایت ہی اہم سبق ہے جسے ہر ہوشمند صاحبِ اختیار نے ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ اُس نے رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی تو مختلف کوششیں کیں لیکن کبھی رائے عامہ کو پائے استحقار سے ٹھکرانے کی حماقت نہ کی کیونکہ وہ اس حرکت کے نتائج سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اسے یہ حقیقت معلوم تھی کہ عوام کا مکمل اعتماد حاصل کیے بغیر جو قدم بھی اٹھایا جاتا ہے وہ ہمیشہ ناکام اور نامراد ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں غفلت اقتدار کے لیے بربادی اور موت کا پیغام ہے۔ جس فرد یا گروہ نے اس بنیادی حقیقت سے صرفِ نظر کیا اسے اپنے اخلاص، سوز مندی اور محنت کے باوجود ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اُس کی نیک نیتی، قوم اور ملک سے گہری محبت بھی اس کی اس لغزش کی تلافی نہ کر سکی۔

ہٹلر اور مسولینی کی حب الوطنی اور قوم پرستی میں آخر کس کو شک ہو سکتا ہے۔ اُن کی جرأت اور پیہم جدوجہد کے بارے میں کسے کلام ہے لیکن ان کی یہ ساری انسانی صفات اُس بنیادی کمزوری کے مقابلے میں بالکل بیکار ثابت ہوئیں جو انہوں نے قوم سے معاملہ کرنے میں دکھائی تھی۔ انہوں نے لوگوں کے اندر محض نفرت کے جذبات اُبھار کر انہیں اپنی رائے کا غلام بنانا چاہا۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی قوم سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ آنکھیں بند کر کے اُس کی پیروی کرتی چلی جائے اور شعور کو اپنے عمل میں دخیل نہ ہونے دے۔ لیکن اس مطالبہ کا جو حشر ہوا وہ آج سب کے سامنے ہے۔ جرمنی جیسی مہتم بالشان قوم آج جس کس مپرسی کے عالم میں زندگی بسر کر رہی ہے اُس پر ہر صاحبِ دل خون کے آنسو بہاتا ہے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ اُس سے کہیں زیادہ کمزور قومیں اپنی آزادی برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئیں لیکن اس آزاد منش قوم کو غلامی کی زنجیریں پہننی پڑیں۔ کیا اس میں ہمت و جرأت کا فقدان تھا۔ کیا اس کے ذرائع دوسری قوموں سے کم تھے۔ کیا اس کے پاس اسلحہ اور بارود کی قلت تھی؟ کیا اس کے رہنماؤں کا اخلاص مشتبہ تھا۔ کیا اُن کے اندر تدبیر کی صلاحیتیں ناپید تھیں؟ کیا وہ دوسری اقوام کے رہنماؤں کی طرح حوصلہ مند نہ تھے۔ آخر ان میں کس چیز کی کمی تھی کہ انہوں نے اتنی زبردست قوم کو برباد کر کے رکھ دیا۔ ان مختلف سوالات کا تاریخ صرف ایک ہی جواب دیتی ہے کہ ان میں اخلاص اور جوشِ عمل کی کمی نہ تھی بلکہ فہم و فراست کا فقدان تھا۔ انہوں نے محض اپنی حماقت سے قوم کو ذی شعور افراد کا ایک

منظم گروہ سمجھنے کی بجائے بے شعور بھیڑوں کا گلہ سمجھا اور پھر اُسے میکانکی طور پر محض ڈنڈے کے زور سے ہانکنے کی مذموم کوشش کی۔ جب تک جذبات متلاطم رہے اور احساسات میں اشتعال موجود رہا اس وقت تک عوام کا فہم و شعور دبا رہا اور وہ بیچارے ان احمق لیڈروں کے اشاروں پر بلا چون و چرا کٹتے رہے۔ لیکن جذبات کی شدت کو دیر تک برقرار نہ رکھا جا سکا جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ ٹھٹھری ہوئی فکری قوتوں میں حرکت نمودار ہوئی اور جو دماغ جذبات کی پیہم یلغار کی وجہ سے سُن ہو چکے تھے انہوں نے اپنے حالات پر غور کرنا شروع کیا اور وہ اس حقیقت کو سمجھنے لگے کہ انہیں موت کے خوفناک گڑھے کی طرف لاشعوری طور پر دھکیلا جا رہا ہے ۔ فسطائیت جیسے جس غیر انسانی فلسفے پر ان کی پرورش ہو رہی تھی وہ اُن کے اندر عقل و فکر کی قوتوں کو برباد کر کے ان کے اندر وقتی جوش اور ہیجان تو پیدا کر سکتا تھا لیکن اس سے کسی قسم کی مستقل تعمیر کا کام نہیں لیا جا سکتا ۔ یہ ایک منفی داعیہ ہے جسے صرف نفرت و حقارت کے جذبات سے قوت مہیا کی جاتی ہے۔ اس میں کسی صحت مند انقلاب کے جوہر پیدا نہیں ہو سکتے۔

یہ احساس جس سرعت کے ساتھ لوگوں کے اندر بیدار ہوتا گیا اُسی رفتار کے ساتھ اُن کے افعال و اعمال پر افسردگی چھانے لگی۔ ہٹلر کے جابرانہ نظام کے تسلّط کی وجہ سے عوام بظاہر خاموش تھے اور اُن کے اعضا اُس کے احکام کے مطابق حرکت بھی کرتے تھے لیکن یہ سب کچھ بددلی کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ جس عمل کو وجدان کی تائید اور عقل و فکر کی حمایت حاصل نہ ہو وہ کبھی بھی دنیا میں مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتا۔ اُس کی حیثیت اُس بُلبلے کی سی ہے جس کا سارا دار و مدار صرف جھوٹے پراپیگنڈہ پر ہو اور جسے حقیقت کا ایک خفیف سا جھونکا بالکل نیست و نابود کر کے رکھ دے۔

وہ کام جس کے بارے میں انسان کا وجدان قدم قدم پر پکار کر کہتا ہو کہ یہ غلط ہے اور اُس کا شعور ہر گام پر اُس کے باطل ہونے کی دہائی دے ، اُس کام کے متعلق انسان کے اندر کبھی بھی اخلاص پائیداری ، سوز مندی اور یکسوئی پیدا نہیں ہو سکتی۔ جس راستہ کے پُرخطر ہونے کا ایک فرد کو مکمل احساس ہو اُس راستے پر آخر وہ خوش دلی کے ساتھ کیونکر گامزن ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے آپ ڈرا دھمکا کر چند قدم

ہانکنے میں کامیاب ہو جائیں۔ لیکن وہ ہر لمحہ آپ کے چنگل سے آزاد ہونے کی کوشش کرے گا اور اُسے جس وقت راہ فرار ملے گی وہ اُسی وقت بھاگ نکلے گا۔ خوف وہراس وجدان اور شعور کو کچھ دیر کے لیے بے بس تو بنا سکتا ہے لیکن انہیں تبدیل نہیں کر سکتا۔ اُن کی تبدیلی کی ہر تحریک اندر سے بیدار ہوتی ہے اور اس کے منظم کرنے کا اگر خاطر خواہ انتظام نہ کیا جائے تو قوت کا مظاہرہ خواہ وہ کتنے وسیع پیمانہ پر ہی کیوں نہ ہو اُلٹے نتائج پیدا کرتا ہے۔

آپ اگر پاکستان کے حالات کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہاں کے برسرِ اقتدار طبقہ نے ہمیشہ طاقت کے زور سے عوام سے اپنی بات منوانے کی کوشش کی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ جس کے ہاتھ میں بھی عنانِ اختیار آتی ہے وہ فوج پولیس اور انتظامیہ کی قوت کا بے دریغ استعمال کرتا ہے اور اس کی مدد سے ایک طرف تو اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جماتا ہے اور دوسری طرف لوگوں سے اس امر کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے دلوں پر اُس کا بلا شرکتِ غیر تسلط تسلیم کر لیں۔ وہ اپنے اندازِ حکمرانی سے عوام پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ میرا من الخطا ہے۔ اس وجہ سے وہ کسی مشاورت کا ضرورتمند نہیں اور کسی رائے کا محتاج نہیں۔ وہ جو کر دے اور جو کہ دے وہی درحقیقت نشائے فطرت ہے۔ لوگوں کا فرض صرف اسی قدر ہے کہ وہ اُس کی ذاتی رائے کو ملک کا قانون سمجھیں، اُس کے ذاتی افکار و نظریات پر اپنی معاشرتی زندگی کی تعمیر کریں۔ وہ جس بات کو حق کہ دے لوگ اُسے حق جانیں اور اُس کی زبانِ فیض ترجمان سے جس چیز کے باطل ہونے کا فتویٰ صادر ہو جائے اُسے وہ بغیر کسی تردّد کے باطل مان لیں۔ الغرض لوگوں کے ضمیر، شعور اور وجدان حاکم کے نظریات کے یکسر تابع ہوں۔

ایک طرف اقتدار کا پاکستانی عوام سے یہ غیر انسانی اور غیر فطری تقاضا ہے اور دوسری طرف عوام اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ نہیں پاتے کہ وہ اقتدار کو کبریائی کے ایسے اونچے مقام پر

قائم کردیں جہاں اُس کی کسی رائے سے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ دنیا کی کوئی باشعور قوم یہ منصب خدا اور اُس کے بھیجے ہوئے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کسی اونچے سے اونچے فرد یا کسی منظم سے منظم گروہ کو دینے پر تیار نہیں ہوسکتی۔ افراد کی فطرت اُن سے بار بار اس امر کا مطالبہ کرتی ہے کہ انہیں جو کچھ کہا جا رہا ہے یا جو کچھ مختلف پروگراموں کی شکل میں اُن کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اُس پر اُن کے دل و دماغ کو مطمئن کیا جائے۔ کیونکہ قلبی اطمینان حاصل کیے بغیر وہ چند قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔

ہمارے اس ملک میں پندرہ سال سے زندگی کے ہر شعبہ میں جو شدید کشمکش نظر آتی ہے وہ حکمراں طبقوں کی اسی احمقانہ ضد اور ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ وہ خواہ زبان سے یہ بات نہ کہیں لیکن اُن کا اپنی قوم سے سب سے اہم مطالبہ صرف ایک ہے کہ وہ غور و فکر اور تدبر و تفکر کے انسانی بنیادی حق سے یکسر دست بردار ہو جائیں اور یہ کام پوری خوش دلی اور نیک نیتی کے ساتھ صرف تخت و تاج کے وارثوں کو تفویض کردیں اور اگر وہ یہ ایثار اور قربانی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تو پھر وہ ملک کے غدار اور غیر ملکی سامراج کے ایجنٹ ہیں۔ اُن کی حب الوطنی اور قوم سے محبت کا راز صرف حکمراں طبقہ کی غیر مشروط اطاعت اور چاکری میں مضمر ہے

آپ اگر قیامِ پاکستان سے لیکر اس وقت تک کی سرکاری کارگزاریوں کا جائزہ لیں تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس ملک میں جو بھی برسرِ اقتدار آیا اُس نے سب سے پہلے اپنے آپ کو عوامی احساسات و جذبات سے بیگانہ بنانے کی کوشش کی تاکہ وہ پوری شانِ بے نیازی کے ساتھ اپنی مرضی کو عوام پر مسلط کر سکے۔ اس نے اپنے کردار اور طرزِ عمل سے یہ ثابت کیا کہ یہ ملک انسانوں سے آباد نہیں بلکہ بے زبان جانوروں سے بھرا پڑا ہے اس لیے اُسے کسی کی آواز پر کان دھرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ ملکی دستور جیسے اہم مسئلے سے لیکر معمولی سے معمولی معاشرتی سرگرمیوں تک میں عوامی رائے کو یکسر نظرانداز کیا جاتا رہا ہے اور لوگوں نے جب بھی ان معاملات میں لب کشائی کی تو اُن کے سینے یا تو گولیوں سے چھلنی کیے گئے یا سیفٹی ایکٹ جیسے غیر انسانی

قوانین کا سہارا لے کر انہیں جیلوں میں ٹھونس دیا گیا یا اُن پر غداری اور وطن دشمنی کا الزام لگا کر انہیں عوام میں بدنام کرنے کی تدبیریں سوچی گئیں۔ ان عقل کے اندھوں نے اپنے بھائی بندوں سے لڑنا تو پسند کیا لیکن کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ آخر یہ سارے لوگ دیوانے تو نہیں ہو گئے کہ وہ خواہ مخواہ اُن سے ہر معاملہ میں اُلجھ رہے ہیں۔

یہاں دستور کی ترتیب کے لیے کئی مرتبہ مختلف کمیٹیاں قائم کی گئیں لیکن ہر بار رائے عامہ سے تغافل برتا گیا۔ یہاں آرٹ اور کلچر کے نام پر فحاشی اور بد معاشی کو فروغ دیا گیا اور لوگوں نے اس روش کے خلاف جب آواز اٹھائی اور کہا کہ یہ آرٹ جسے یہاں کا برسرِ اقتدار طبقہ مغرب کی اندھی تقلید میں فروغ دینا چاہتا ہے وہ اس قوم کے مزاج کے سراسر منافی ہے اور اس کے رواج پانے سے اس کی اخلاقی اقدار تباہ و برباد ہو جائیں گی، تو اس طبقے نے استکبار کے لہجہ میں کہا: "یہ ایک وحشت اور دیوانگی کی آواز ہے جو تنگ نظر اور سرپھرے ملاؤں کے حجروں سے بلند ہو رہی ہے۔" اس سے آگے بڑھ کر جب اس طبقے نے اس قوم کی عائلی زندگی کو درہم برہم کرنے کے لیے عائلی قوانین وضع کیے تو پوری قوم نے یک زبان ہو کر اس کی اس حرکت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور دلائل سے ثابت کیا کہ ان قوانین کے نفاذ سے اس قوم کی معاشرتی زندگی میں ایک زبردست بگاڑ پیدا ہو گا۔ لیکن حکمرانوں نے ان کی کسی بات پر توجہ نہ دی بلکہ قوت کے زور سے انہیں خاموش کرنا چاہا۔

اس طبقہ کی عوامی احساسات سے یہ سرد مہری بلکہ تغافل اور بے پروائی دیکھ کر انسانی ذہن میں اُن یونانی دیوتاؤں کا تصور گھومنے لگتا ہے جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ انسانی آبادیوں سے بہت دُور بالکل الگ تھلگ ہو کر پہاڑوں پر عیش و آرام کی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ انہیں انسانوں کے مسائل، اُن کی مشکلات اور پریشانیوں اور اُن کے جذبات سے قطعی کوئی تعلق نہ تھا، اور انہوں نے کبھی انسانوں کے مصائب و آلام کے متعلق سوچ کر اپنے آپ کو رنجیدہ خاطر کرنا پسند نہ کیا۔ انسانی بستیاں زلزلوں کی وجہ سے زیر و زبر ہوتیں، لوگ برباد ہوتے اور اس مصیبت کے عالم میں آہ و فغاں بلند کرتے لیکن یہ بے حس دیوتا اس نالہ و فریاد سے موسیقی کا لطف حاصل کرتے۔ جب جہاز ڈوبتے اور لوگ اپنی جانیں بچانے

کے لیے سراسیمہ ہو کر ادھر اُدھر بھاگتے تو ان دیوتاؤں کو اس میں رقص کا مزہ آتا۔ انسانی آبادیوں میں جب جنگ و جدال شروع ہوتا، یا قتل و غارت کا بازار گرم ہوتا یا بیماری اور قحط کی وجہ سے لوگ مختلف مصائب میں گرفتار ہوتے تو ان روح فرسا واقعات اور حوادث کو دیکھ کر ان دیوتاؤں کو قلبی مسرت ہوتی کیونکہ یہ بھیانک مناظر اُن کے لیے تفریح طبع کا سامان تھے۔

ٹھیک یہی یا اس سے ملتا جلتا رویہ اس ملک کے اصحابِ اقتدار نے یہاں کے عوام کے معاملے میں اختیار کر رکھا ہے۔ معلوم نہیں انہیں اس ملک کے باشندوں کو تنگ کرنے میں کونسی لذت محسوس ہوتی ہے کہ وہ برابر اس امر کا التزام کرتے رہتے ہیں کہ انہیں کسی نہ کسی طرح ضرور ستایا جائے۔ یہ لوگ جان بوجھ کر ایسے کام کرتے ہیں جن سے ان بیچاروں پر عرصۂ حیات تنگ ہو، ان کے جذبات اور احساسات مجروح ہوں اور پھر وہ واویلا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پائیں۔ آپ دور نہ جائیے بالکل سامنے کی ایک مثال لیجیے۔

اس ملک میں جو نظامِ تعلیم و تربیت انگریز نے رائج کر رکھا تھا وہ اس ملک کے باشندوں کے عزائم اور مقاصد کی تکمیل نہ کر سکتا تھا۔ یہ ایک غیر ملکی سامراج کا مرتب کردہ نظام تھا جسے آزادی کی صبح طلوع ہونے کے ساتھ ہی بدل دینے کی اشد ضرورت تھی تاکہ ہم اپنی نوخیز نسلوں کی دینی و ملی ضروریات کے تحت صحیح طریق سے تربیت کر سکیں۔ ان حالات کے تحت قوم کو اس امر کی بجا طور پر توقع تھی کہ اس ملک کے نظامِ تعلیم میں اب جو تبدیلی بھی کی جائے گی اُس میں ہمارے قومی مزاج، ہماری روایات، ہمارے افکار و نظریات اور ہمارے ملکی حالات کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔ لیکن اس سلسلہ میں فی الواقع جو کچھ ہوا ہے وہ انتہائی مایوس کن اور افسوسناک ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ کسی غیر ملکی آمر نے جسے اس ملک کے باشندوں کی نفسیات اور اُن کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اُس نے محض ستانے کی غرض سے اسے عوام پر ٹھونسنے کی کوشش کی ہے۔

اس تبدیل شدہ نظام کا جائزہ لیجیے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو گی کہ اس میں سر سے وہ

بنیادہی غائب ہے جس پر کسی صحت مند نظامِ تعلیم کی تعمیر کی جاسکتی ہے۔ دنیا کا ہر نظام سب سے پہلے اس امر کا فیصلہ کرتا ہے کہ اسے اپنی نوجوان نسل کو کس کلچر کا خادم بنانا ہے، اس کے دماغ میں کس قسم کے افکار و تصورات کی آبیاری کرنی ہے اور اُس کے دل میں کن اقدارِ حیات کا نقش بٹھانا ہے تاکہ اُس کے فکر و عمل اور جذبہ و احساس میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔

آپ تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کو اوّل تا آخر پڑھ جائیں آپ کو کہیں بھی اُس بنیادی نقطۂ نظر کی جھلک نہ ملے گی جو کسی نظامِ تعلیم کی جان ہوتا ہے۔ یہاں مختلف اقوام کے تصورات کو نہایت ہی بھونڈے انداز سے ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ کو اگر اس فکری انتشار کا اندازہ لگانا مقصود ہو تو صرف ایف، اے کے انگریزی نصاب کی ایک کتاب "ہوا کے دوش" کا ذرا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ اس میں کس قسم کے بے ربط خیالات کو کس نامعقولیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس نوعیت کی کتابیں پڑھنے والے ملت کی جو فکری رہنمائی کریں گے تو اس کا تو بخوبی اندازہ ہو ہی سکتا ہے۔ میرے نزدیک اگر وہ اپنا دماغی توازن ہی برقرار رکھ لیں تو یہی اُن کی ذہانت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ یہ عقل و فکر کو جلا دینے والی کتاب نہیں بلکہ اُن کی دماغی قوتوں کو منتشر کرنے والا ایک بیکار مجموعہ ہے جس سے بچے کی ذہنی صلاحیتیں نشو و نما پانے کی بجائے ٹھٹھر کر رہ جائیں گی۔ ملک کے ماہرینِ تعلیم ذرا اُن بچوں سے رابطہ قائم کر کے اُن کی آرا معلوم کریں جنہیں قوت کے زور سے اس آزمائش میں جھونک دیا گیا ہے۔

پھر اس نظامِ تعلیم کے مرتب کرنے والوں نے شروع ہی سے اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے کہ دنیا کی کوئی ہوشمند قوم اپنے ہاں تعلیم و تربیت کا کوئی ایسا نظام قائم نہیں کرتی جسے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے دوسروں کے سامنے ہر مرحلہ پر دستِ سوال دراز کرنا پڑے۔ نظامِ تعلیم کسی قوم کی اجتماعی زندگی میں اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی کہ کسی فرد کی زندگی میں سانس۔ آپ کپڑے کے معاملے میں کسی دوسرے کے محتاج ہو سکتے ہیں، خوراک اور اپنی دوسری ضروریات کی فراہمی کے لیے کسی دوسرے پر انحصار کر سکتے ہیں لیکن آپ کی زندگی کے لیے اُس سے زیادہ منحوس دن کوئی نہیں ہو سکتا جب آپ سانس

کسی لیے دوسروں کے دست نگر ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اپنی زندگی پر قطعاً کوئی اختیار باقی نہیں رہا وہ سراسر دوسرے شخص کے ہاتھ میں ہے اور وہ جب چاہے اپنی منشا اور مرضی کے مطابق آپ کی حیات کا چراغ گل کر دے۔ آخر سوچیے کہ دنیا کا کوئی کمزور سے کمزور انسان بھی اپنی زیست کے بارے میں یہ ذلیل موقف قبول کر سکتا ہے۔

ایک انسان جس طرح جسم و روح کے تعلق کے قائم رکھنے میں دوسروں کا محتاج نہیں بننا چاہتا، بالکل اسی طرح دنیا کی کسی عقلمند قوم نے اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ وہ اپنی نوخیز نسلوں کی اخلاقی تربیت اور ذہنی نشوونما کے لیے دوسروں پر بھروسہ اور اعتماد کرے۔ کیونکہ اس دائرۂ کار میں اعتماد بسا اوقات قوموں کی ہستی کو ہی مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ حیاتِ اجتماعی میں نظامِ تعلیم روح کی حیثیت رکھتا ہے اور کوئی قوم خواہ وہ معاشی اعتبار سے کتنی ہی بدحال ہو لیکن اگر اُس میں زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا داعیہ موجود ہے تو وہ روح کی غلامی پر کبھی بھی رضامند نہیں ہو سکتی۔

ہٹلر کی جذباتیت شوریدہ سری اور آمریت سے کون ناواقف ہے لیکن اُسے بھی خداوند تعالیٰ نے یہ سمجھ بوجھ دے رکھی تھی کہ اُس نے عین زمانہ جنگ میں جب اُس کی طرف ہر طرف سے آگ کے شعلے لپک رہے تھے، بچوں کی تربیت سے معمولی غفلت بھی نہ برتی بلکہ انہیں ان پُرآشوب حالات میں ملک سے نکال کر سوئٹزرلینڈ بھیج دیا تاکہ وہ وہاں یکسوئی کے ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ اُس کے ایک رفیقِ کار نے جب ایک موقع پر اس کی علت دریافت کی تو اُس نے جواب میں کہا: اگر ان بچوں کو ہم اپنے قومی عزائم کے تحت تربیت دینے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر جرمن قوم کو مٹانا ناممکن ہو گا۔ جو صفیں خالی ہوں گی انہیں کل بڑی آسانی کے ساتھ پُر کیا جا سکے گا۔ لیکن اگر ایک مرتبہ ہمارے ہاں خلا پیدا ہو گیا تو پھر اس قوم کو بربادی سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔

اسے ہماری بدنصیبی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے تعلیمی کمیشن نے ہمارے لیے جو

نظامِ تعلیم تجویز کیا ہے ہمارے اپنے وسائل اُس کے کسی طرح بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم اُس کے نفاذ کے لیے اور پھر اُسے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے یکسر دوسروں کی امداد کے محتاج ہیں۔ ہمارے نزدیک ان سفارشات کا سب سے تکلیف دہ اور تاریک پہلو یہی ہے کہ امریکہ کی خیرات کے بغیر یہ ایک دن بھی کامیابی کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے ابتدائی نتائج تو کھل کر سامنے آرہے ہیں۔ وہ ادارے جو اگرچہ سرکاری نصاب اپنے ہاں پڑھا رہے تھے لیکن جو کسی حد تک اپنی آزادی کو بھی برقرار رکھنا چاہتے تھے اور اپنے آپ کو بالکل حکومت کی تحویل میں دینا پسند نہ کرتے تھے وہ یا تو ایک ایک کر کے دم توڑ رہے ہیں یا اپنی آزادی کو مالی امداد کے عوض رہن رکھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔

یہ صورتِ حال کسی جمہوری ملک کے لیے انتہائی تشویشناک ہے۔ دنیا کا ہر جمہوری ملک اس بات کا پورا پورا التزام کرتا ہے کہ لوگوں کے اندر حریتِ فکر اور ضمیر کی آزادی پوری طرح پرورش پائے کیونکہ ان کی صحت مند نشو و نما پر ہی جمہوریت کی کامیابی کا سارا دارومدار ہوتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ انگلستان اور امریکہ میں اس بات کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ تعلیمی ادارے حکومت کے تسلط سے جہاں تک ممکن ہو آزاد رہیں۔ ان اداروں کو زیادہ تر فلاحی انجمنیں چلاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اداروں سے جو نوجوان تعلیم حاصل کر کے زندگی کے میدان میں نکلتے ہیں اُن کے اندر ضمیر کی کافی آزادی پائی جاتی ہے۔ انگلستان کی دو مشہور یونیورسٹیاں کیمبرج اور آکسفورڈ مخیّر حضرات کے چندوں پر نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہی ہیں۔ انگلستان کے بہترین دماغوں نے انہی یونیورسٹیوں میں جلا پائی ہے۔

پاکستان میں جو نظامِ تعلیم رائج کرنے کا منصوبہ تیار ہوا ہے وہ اس نقطۂ نظر سے انتہائی مایوس کن ہے۔ اس میں اس بات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ تعلیمی اداروں کی آزادی پوری طرح سلب کر لی جائے تاکہ اُن کے اندر حریتِ فکر کا کوئی احساس باقی نہ رہے۔ معلم اور متعلم دونوں حکومت کے براہِ راست دستِ نگر ہوں اور حکومت ان کے اندر جس قسم کے خیالات اور احساسات کی پرورش کرنا چاہے وہ بڑی آسانی کے

ساتھ کر سکے۔ تعلیمی کمیشن کی رپورٹ میں تعلیم کی منصوبہ بندی نہیں کی گئی بلکہ اس کی حکڑ بندی کی فکر کی گئی ہے۔ اسے دیکھ کر تو روسی نظامِ تعلیم کی قہرمانیوں کا تصور آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔

تعلیم و تعلّم پر یہ ناروا پابندی بلکہ مجنونانہ حکڑ بندی اگر ملی تقاضوں کے تحت ہوتی تب بھی شاید عوام اسے ملکی اور قومی مفاد کے نام پر کسی حد تک گوارا کر لیتے لیکن اس کے پیچھے جو محرکات کارفرما ہیں ان میں ملی مفادات کا عنصر یکسر ناپید ہے۔

اس حکڑ بندی کا سب سے پہلا اثر یہ ہوگا کہ تعلیم صرف امراء کے طبقہ میں محدود ہو کر رہ جائے اور بے چارے عوام اس سے یکسر محروم ہوں گے۔ یہ چیز ملکی مفاد کے سراسر منافی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیم صرف انہی لوگوں کو حاصل کرنی چاہیے جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں اور باقی افراد کو صنعتی تربیت کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ایک نہایت ہی بھونڈی دلیل ہے۔ اوّل یہ کہ امتحان کسی شخص کی قابلیت کا واحد معیار نہیں ہو سکتا۔ بہت سی ایسی مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں جن میں نہایت معمولی نمبروں سے لوگوں نے امتحانات پاس کیے لیکن جب انہوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو وہاں انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ پھر اس ملک میں حکومت نے کتنے ایسے صنعتی ادارے قائم کر رکھے ہیں جن میں لوگ حسبِ خواہش تربیت حاصل کر سکتے ہیں۔ امریکہ اور انگلستان کے حالات کو پیشِ نظر رکھ کر پاکستان کے لیے تعلیمی لائحۂ عمل تیار کرنا اگر ابلہ فریبی نہیں تو اور کیا ہے۔

اس غریب ملک کے لیے جس کی دولت کا معتد بہ حصہ صرف دو سو خاندانوں کے اندر گردش کر رہا ہے ایک ایسا نظامِ تعلیم تجویز کیا گیا ہے جس سے ملک کی عظیم اکثریت قطعاً کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صرف چند مالدار گھرانوں کے بچے تعلیم سے بہرہ مند ہو سکیں گے۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہے کہ یہ وہ خاندان ہیں جن کے اندر مغربی اقدارِ حیات کی پوری طرح پرستش ہوتی ہے۔ آپ ان سے تعلق رکھنے والے افراد سے اگر رابطہ قائم کریں تو آپ کو

معلوم ہو گا کہ یہ حضرات مغرب کی ذہنی غلامی میں بُری طرح گرفتار ہیں۔ ان کے افکار و نظریات، احساسات و جذبات، عادات و خصائل اور طرزِ معاشرت، الغرض ان کی پوری زندگیاں مغربی تہذیب میں رنگی ہوتی ہیں۔ سوائے رنگ اور نسل کے اشتراک کے، ان کے اور ملک کی عام آبادی کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں۔ ان کے سوچنے کا انداز، ان کے خوب و ناخوب کے پیمانے اور ان کے رہنے سہنے کے طریقے، بلکہ ان کی بستیاں بھی عام لوگوں سے الگ تھلگ ہیں۔ ان کا ملک کے باشندوں اور ان کے احساسات سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ کسی غیر ملکی کا ہو سکتا ہے۔ اس لیے ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ ملک کی عنانِ اقتدار تھام کر اسلامی کلچر کی خدمت کریں گے ایک ایسی خوش فہمی ہے جس کے ڈانڈے حماقت اور بیوقوفی سے ملے ہوتے ہیں۔ اس گروہ کے کسی فرد کے پاس چلے جائیے اور اُس سے بات کر کے دیکھیے، آپ اسے سوائے رنگ کے ہر لحاظ سے انگریز یا امریکی پائیں گے۔

اس نئے نظامِ تعلیم کے نتیجے میں جب تعلیم کا حصول صرف اسی ایک طبقہ کی اجارہ داری بن جائے گی تو پھر ملکی معاملات میں قیادت اور سربراہی کا منصب بھی لازمی طور پر بلا شرکت غیرے انہی کے ہاتھ میں رہے گا۔ غریب اور متوسط طبقے ملک کے انتظام و انصرام سے آہستہ آہستہ بے دخل ہوتے چلے جائیں گے اور ملک کی قسمت کا فیصلہ صرف ان "صاحب بہادروں" کے ہاتھ میں ہو گا۔ وہ جس ڈگر پر چاہیں گے ملک کو چلا لے جائیں گے۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جسے ہر صاحبِ فہم اچھی طرح جانتا ہے۔

ایک طرف تو ملک کے اندر تعلیم کو مغرب پرست طبقہ کے اندر مقید کیا جا رہا ہے اور اس پر مزید ستم یہ ہے کہ جو نئی تعلیمی پالیسی مرتب کی گئی ہے اس کے ترتیب دینے والے یا تو غیر ملکی لوگ ہیں یا اپنے ملک کے ایسے افراد جو اہلِ پاکستان کے عزائم کی نمائندگی کرنے کی بجائے امریکہ اور انگلستان کے باشندوں کے احساسات کی ترجمانی کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ ان "اسیرانِ دانشِ فرنگ" کو اپنی تہذیب اور اپنے تمدن پر قطعاً کوئی اعتماد نہیں بلکہ اُن کے قلب و دماغ کو مغربی

اقدارِ حیات نے پوری طرح مفتوح کر رکھا ہے۔ چنانچہ جو تعلیمی پالیسی طے کی گئی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کے اندر صرف امراء کا طبقہ جو مغربی تمدن کی ظاہری چمک دمک سے پہلے ہی سخت مرعوب ہے تعلیم سے بہرہ مند ہوگا اور اس طبقہ کی قیادت اور رہنمائی براہِ راست وائٹ ہاؤس سے ہوا کرے گی کیونکہ "آقائے ولی نعمت" کی نظرِ کرم کے بغیر اس نظام کو اس ملک میں کامیابی کے ساتھ چلایا نہیں جا سکتا

ابھی یہ سطور لکھی جا رہی تھیں کہ حکومت نے سہ سالہ ڈگری کورس کی بجائے دو سالہ ڈگری کورس کا اعلان کر دیا۔ اس تبدیلی کا میری ان گزارشات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایک سال کی کمی بیشی سے وہ سارا نقطۂ نظر تبدیل نہیں ہو سکتا جو اس تعلیمی پالیسی کے اندر کارفرما ہے۔ البتہ اس اعلان سے پھر ایک مرتبہ یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ ہمارے برسرِ اقتدار طبقہ کو عوامی احساسات اور اہلِ وطن کی دشواریوں کی قطعاً کوئی خبر نہیں ہوتی اور انہیں اپنے مصائب اور اپنی مشکلات سے آگاہ کرنے کے لیے وہی حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں جو انگریزی عہد میں صاحب بہادر کو جھنجھوڑنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے "بدیشی صاحب" کی یہ بے خبری تو کچھ سمجھ میں آتی ہے لیکن ان دیسی آقاؤں کی "شانِ بے نیازی" دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کیا یہ لوگ باشندگانِ ملک کے حالات سے اتنے غافل ہیں کہ انہیں اپنی قوم پر کوئی بوجھ لادتے وقت یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ ہمارے عوام اس بوجھ کو برداشت کرنے کی سکت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ انگریز اگر یہ ظالمانہ روش اختیار کرتا تھا تو اس کی ایک وجہ تھی۔ اس کی یہ بنیادی پالیسی تھی کہ وہ لوگوں کو تنگ کر کے انہیں دق کر کے اور ستا کر اُن کا ردِ عمل معلوم کرے اور یہ دیکھے کہ ابھی ان میں کتنی جان باقی ہے اور اسے ختم کرنے کے لیے اُسے کونسی نئی پالیسی مرتب کرنا ہے۔ لیکن اپنے بھائی بندوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنی ملّت کے صبر کا مسلسل امتحان لیتے رہیں۔ صبر کی بھی بہرحال ایک حد ہے اور اس پیمانہ میں خواہ کتنی

وسعت ہو لیکن ایک وقت ضرور ایسا آتا ہے جب یہ ساری وسعتوں کے باوجود چھلک پڑتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ یہ نوبت آئے لیکن اہل ملک کو جس طریق سے پریشان کیا جا رہا ہے اسے دیکھ کر یہ چیز کوئی بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتی

یہ گزارشات ہم کوئی سنسنی پیدا کرنے یا خوف وہراس پھیلانے کی غرض سے نہیں کر رہے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر پوری انسانی تاریخ گواہ ہے۔ جب ایک بھائی ہی اپنے بھائیوں کو بلاوجہ آزمائشوں کی بھٹی میں جھونکنا شروع کر دے تو حقارت اور نفرت کے جذبات میں زیادہ شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس شخص کو انسان اپنا دمساز اور دلسوز رفیق سمجھتا ہو اس سے تو اسے فطرتاً یہی توقع ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف اس کی مشکلات اور پریشانیوں سے پوری طرح آگاہ ہو گا بلکہ ان میں برابر کا شریک بھی ہو گا اور اپنے وسائل کے مطابق انہیں حتی المقدور دور کرنے کی کوشش کریگا۔ قومی احساسات کے معاملے میں یہ بیگانگی ممکن ہے برسرِ اقتدار طبقہ کے جذبۂ کبر کے لیے کسی حد تک تسکین کا سامان فراہم کر سکے لیکن اس کی وجہ سے قوم کے اعتماد کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ عوام یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان حاکموں کا ہمارے ساتھ سوائے ٹیکس وصول کرنے اور سزائیں دینے کے اور کوئی سروکار نہیں۔ جب دل کے آبگینوں کو ٹھیس لگ جائے تو پھر وہ کسی صحیح بات کے لیے بھی خوش دلی اور اخلاص کے ساتھ برسرِ اقتدار طبقے کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور اس طرح ایک ملت کے اندر ہی اختلافات کی ایسی وسیع خلیج حائل ہو جاتی ہے جسے کوئی نعرہ بازی پاٹ نہیں سکتی۔

ہم اس ملک کے برسرِ اقتدار طبقہ کی خدمت میں پورے اخلاص کے ساتھ یہ عرض کرتے ہیں کہ براہِ کرم اپنی روش بدلنے کی کوشش کیجیے۔ یہ قوم جس پر آپ کو حکمرانی کا موقع ملا ہے آپ کی اپنی قوم ہے۔ خدارا اس کے احساسات کی گہرائیوں میں اتر کر ان کی وسعت، گہرائی اور نوعیت کا صحیح صحیح اندازہ لگائیے۔ اور یہ دیکھیے کہ یہ قوم آخر تم سے کس چیز کی توقع رکھتی ہے اور اس کے مطالبہ میں

کتنی معقولیت ہے۔ آپ کی حقیقی عزت یہ نہیں کہ کوئی غیر ملکی اخبار آپ کی تصویر شائع کردے یا آپ کے بارے میں کلمۂ خیر کہہ دے، یا کسی ملکہ کے حضور میں آپ کو شرفِ باریابی نصیب ہو جائے، یا آپ کو کسی شاہی دسترخوان میں شرکت کا موقع ہاتھ آجائے یا ملک کے چند چاپلوس آپ کی مدح میں کچھ قصائد پڑھ دیں۔ یہ سب چیزیں نقش برآب ہیں، تاریخ نے انہیں کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس قسم کے سارے اعزاز جن پر آپ بڑے مسرور نظر آتے ہیں اپنے اپنے عہد میں اُن سارے لوگوں کو بھی میسر تھے جن پر آج پوری نوعِ بشری لعنت بھیجتی ہے۔ آپ کی حقیقی عظمت کا راز اپنی قوم کے دل مسخر کرنے میں ہے۔ اور یہ چیز اُس کے احساسات کو نظر انداز کرنے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ انہیں ہمدردی اور اخلاص کے ساتھ سمجھنے اور پھر عزم اور دلسوزی کے ساتھ ان کی صحیح طریق سے تربیت کرنے سے ہاتھ آتی ہے۔

اقتدار کے تخت پر متمکن ہو کر نصیحت اور خیر خواہی کی باتیں سننا یقیناً مجاہدہ ہے۔ کیونکہ اقتدار انسان کو کافی حد تک خود پسند بنا دیتا ہے لیکن اگر آپ خود پسندی کے اس طلسم کو توڑ کر عوامی جذبات کو جاننے کی کوشش کریں تو آپ اپنے آپ پر اور اس مظلوم ملت پر بہت بڑا احسان کریں گے اور تاریخ میں آپ ایک ایسی اچھی یادگار چھوڑیں گے جو انسانیت کا بیش قیمت سرمایہ ہوگا اور آئندہ جب کبھی بھی عدل و انصاف، اور حق پرستی کا تذکرہ کیا جائے گا تو ان کے ساتھ آپ کا نام بھی خود بخود لوگوں کی زبانوں پر آجائے گا۔

مرکز میں مکتبہ کا قیام

مرکز میں آنے والے رفقاء متوجہ ہوں

خواتین کا تعمیری و اصلاحی جریدہ ماہنامہ "بتول" اور ——— ادارۂ بتول و اسلامک پبلیکیشنز لمٹیڈ کی جملہ مطبوعات و دیگر اداروں کی جملہ کتب حسبِ ذیل پتہ پر مل سکتی ہیں۔

ادارۂ بتول۔ ۴ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور